**محمد مسعود عباسی**

اسکالر پی ایچ۔ڈی (اردو)

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

**ڈاکٹر عزیز ابن الحسن**

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

# احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں رسوماتی وتوہماتی عناصر

*Ahmad Nadeem Qasmi was a well-known progressive poet and short story writer. He narrated and painted the real shape of Punjab's rural life. In Punjab province, there is a visible difference between rural andurban community in sense of living styles, customs and standards. Comparatively rural area is more populated as well as more ignorant to the new developments in the modern fields of knowledge. All the atmosphere is overwhelmed by supernatural and feudalistic elements. In this article, the author tried to analyzeQasmi's fiction to dig out the bitter facts of Punjab'srural life.*

ترقی پسند شاعر و افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی ضلع خوشاب کے دور دراز پسماندہ علاقے گاؤں انگہ میں ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری دونوں میدان میں اپنے فن کا سکہ جمایا۔ان کی پہلی نگارش ان کی ایک نظم ''مولانا محمد علی جوہر'' تھی جو ۱۹۳۱ء میں مشہور اخبار روزنامہ ''سیاست'' لاہور میں چھپی ۔کسی بھی ادیب کی پہلی تخلیق ہی اُس کے راستے کا تعین کرتی ہے ۔اس پہلی نظم کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> ''ندیم کی ادبی زندگی کا سب سے پہلا روشن دن وہ ہے جب وہ محمد علی جوہر کی وفات پر مرثیہ لکھتے ہیں۔ندیم کا یہ مرثیہ جدید اردو شاعری کا بے حد معنی خیز واقعہ ہے''۔[۱]

قاسمی کی شاعری کے ساتھ ہی افسانوی زندگی کا دُور شروع ہو جاتا ہے۔ان کا پہلا افسانہ ''بدنصیب بت

تراش'' تھا جو ۱۹۳۶ء میں رسالہ ''رومان'' لاہور میں شائع ہوا۔قاسمی کی اس تحریر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ زمانہ طالب علمی میں بھی خواب اور رومان کی وادیوں میں گھومنے کی بجائے قومی مصائب کا شعور رکھتے تھے۔ وہی شعور ان کی نثر اور شاعری میں نظر آتا ہے۔شاعری اور افسانہ دو الگ الگ مزاج کی اصناف ہیں ان دونوں کا یکجا ہونا اور ایک ساتھ لے کر چلنا اُردو ادب میں بہت کم نظر آتا ہے۔قاسمی صاحب نے اِن دونوں کو ایک ساتھ رکھ کر ایک مثال قائم کی ہے کہ دونوں کو ساتھ لے کے چلنا مشکل نہیں ہے۔انہی دو مختلف اصناف میں بیک وقت فن آزمائی کے بارے میں ایک سوال جناب خلیق احمد خلیق نے احمد ندیم قاسمی سے کیا کہ'' کیا کبھی آپ نے اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کو ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹ محسوس کی ہے''، تو اس کے جواب میں احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں:

> میری شاعری کو افسانہ نگاری نے اور افسانہ نگاری کو شاعری نے نکھارا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ میں صرف شاعر اور افسانہ نگار ہی کیوں ہوں ساتھ ہی مصور اور مغنی اور مجسمہ ساز کیوں نہیں ہوں۔ میرے اندر تو تخلیق فن کا لاوا اگل رہا ہے۔[۲]

قاسمی کا اظہاری اسلوب گوں نہ گوں ہیئتوں کا سنگم ہے۔اگر ان کے فن کو اُن کے مداحین کے گروہ میں رکھا جائے تو دو طرح کی رائے سامنے آتی ہے۔شاعری کے قدردان ان کی افسانہ نگاری کو شعری شخصیت کے ارتقا میں رکاوٹ گردانتے ہیں تو افسانہ نگاری کے پرستار اُن کی شاعری کو افسانوی تکمیل میں فنی رکاوٹ قرار دیتے ہے۔مگر ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کا باہمی رشتہ سوتنوں کا نہیں بلکہ بھائی چارے کا ہے اور دونوں دھارے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔

پریم چند کے بعد دیہات نگاری اور اس سے منسوب رسموں، رواجوں ،توہمات، رہن سہن اور طبقاتی تقسیم کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔قاسمی نے پریم چند کی دیہات نگاری سے ہٹ کر اپنا الگ اسلوب اور مخصوص جغرافیہ اپنایا۔ان کے دیہات اپر پنجاب کے دیہات ہیں ۔ان میں انتہائی حد تک جزئیات نگاری ملتی ہے۔قاسمی کی پیش کردہ ثقافتی حد بندی پر محمد حمید شاہد لکھتے ہیں:

> احمد ندیم قاسمی نے کمال اخلاص سے وادی ءسون کی دیہی تہذیب کو اردو افسانے کا قابل ذکر حصہ

بنا دیا ہے۔ جن لوگوں نے کامیابی سے دیہات کو لکھا ہے اور اپنے با کمال دیہی پس منظر رکھنے والے افسانوں کے ذریعے متاثر کر کے دیہات نگاری کی طرف متوجہ کیا اُن میں احمد ندیم قاسمی کا نام صفِ اوّل میں شمار ہوتا ہے۔[۳]

قاسمی نے درحقیقت پنجاب بلکہ برصغیر کے دیہاتوں میں بسنے والے معاشرے کی ہر خامی کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے خصوصاً کمزور عقیدہ اور علم و عقل سے عاری لوگوں کی حالت زار کا تو مرثیہ لکھا ہے۔ قاسمی کے کردار پسماندہ اور ضعیف الاعتقاد ہیں اور معاشرے کے رسمیات کے شدید دباؤ میں آ کر معمول کی زندگی سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اس انداز میں اِس المیے کو بیان کرتے ہیں کہ قاری کو کرداروں پر غصہ نہیں آتا بلکہ اُن سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ فطری زندگی کے رطب و یابس، نشاط، افسردگی اور تمام جذبوں سے عاری رہ جانے والے لوگ قاسمی کے افسانے کے جہان میں رہتے ہیں۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر قمر رئیس کہتے ہیں:

> یہ ندیم کی وہ مخلوق ہے جس کی روح اتھاہ دکھوں، محرومیوں اور جان کا صدموں سے نڈھال اور زخموں سے چور ہے جو گردو پیش پھیلی ہوئی بہیمیت، شیطنیت، درندگی اور سفا کی کی تاب نہ لا کر اپنے ہوش وحواس کا ایک حصہ گنوا بیٹھی ہے لیکن اس کے باوصف اُن کی روح میں محبت، انسانیت اور غیرت وحمیت کی شمع ٹمٹما رہی ہے۔[۵]

احمد ندیم قاسمی کی دیہات نگاری دراصل پنجاب کے دیہاتوں کے رسوم ورواج اور توہمات کا مرقع اور پوری تاریخ ہے۔ یہاں پر ہر واقع کے پیچھے ایک کہانی اشتراح اس لیے نظر آتا ہے کہ اس روایت کو زندہ رکھا جائے یا اس کی یاد باقی رہے۔ ان رسوم کا احوال کہیں سنگین اور کہیں بہت ہلکا پھلکا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی افسانوی پیش کش اتنی اثر انداز ہے کہ سعادت حسن منٹو جیسا نرگسیت پسند افسانہ نگار بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ بے گناہ پڑھ کر منٹو انھیں خط میں لکھتے ہیں:

> آپ کا افسانہ ''بے گناہ'' واقعتہً میں نے بے حد پسند کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے افسانے اردو میں بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ آپ کے ہاتھ پلاسٹک ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کے موضوع کو آپ نے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ چُھو کر بھی دیکھا

ہے۔ یہ خصوصیت ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کو نصیب نہیں۔ میں آپ کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔۵

احمد ندیم قاسمی کے افسانے کی پوری دنیا میں پنجاب کا کلچر سانس لیتا سنائی دیتا ہے۔ پنجاب کے دیہات کو کہانی کا روپ دینے کا سہرا قاسمی کے سر ہے کیوں کہ اس سے پہلے پنجاب کے دیہات کو کسی طور بھی افسانے میں نہیں ڈھالا گیا تھا۔ اس ضرورت کو قاسمی نے شدت سے محسوس کیا اور پھر ان کے افسانے کا میدان ہی یہی ٹھہرا۔ قاسمی دیہات کی زندگی، رسوم و رواج اور توہمات کی عکاسی بڑی کامیابی سے کرتے ہیں اسی لیے انہیں ''پنجابی تہذیب کا عکاس'' اور ''پنجاب کی آواز'' کہا جاتا ہے۔ قاسمی کو دیہات اور اس کے کلچر سے قلبی لگاؤ تھا جو اُن کی زندگی میں مشاہدے کے ذریعے داخل ہوا، قاسمی کی زبان کی شیرینی اور شاعرانہ مزاجی کے علاوہ اقامتی جزئیات نگاری نے ایک دل کش اسلوب کو جنم دیا۔ پروفیسر وہاب اشرفی کہتے ہیں:

> احمد ندیم قاسمی پنجاب کی زندگی کے عکاس بن کر ابھرے۔ چوپال اور بگولے ان کے ایسے افسانوی مجموعے ہیں جن میں پنجابی زندگی کے خدوخال اُبھر آئے ہیں۔۶

پنجاب کی آواز کے حوالے سے ان کی چھاپ ان کے افسانوں اور شاعری میں واضح نظر آتی ہے۔ انھوں نے پنجاب کے جغرافیہ کو اس کے تمام مضمرات سمیت اجاگر کیا ہے۔ ان کی یہ پیش کش اس طرح کی ہے کہ اس بُنت میں ایک عالمگیر جاذبیت پیدا ہوگئی ہے جو بدیسی کو اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ اسی فضا اور جغرافیے کے تناظر میں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے احمد ندیم قاسمی نے حوالے سے یوں تحریر کیا ہے:

> احمد ندیم قاسمی کی تحریروں میں پنجاب، اور اس کے بھی ایک خاص علاقہ کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے، اس طرح کہ باہر کا کوئی شخص اس کی ترجمانی نہ کرسکتا۔ اور پھر ان میں ہندوستانیت ہی نہیں بلکہ انسانیت کا جوہر ہے اور یہی وصف شاعری اور ادب کی جان ہے۔۷

احمد ندیم قاسمی کے بارے میں یہی رائے دی جاتی ہے کہ وہ محنت کش اور پسے ہوئے طبقے کے لوگوں کی محرومی کی زندگی میں معنویت اور تبدیلی کے خواب ستاروں کی طرح سجا کر ابھرے۔ وہ ایسے فرد تھے جنھوں نے عمر بھر سامراجیت اور ملکیتی نظام کی اقدار سے سمجھوتا نہ کیا۔ انھوں نے زندگی کے حُسن اور دل آویزی کو

اپنے قریب کے پسے ہوئے طبقے کی حیات سے کشید کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کربِ نارسائی کو جھیلا، اِس لیے وہ اپنے ہنر میں شعور وآگہی کے امتزاج سے ایک سنگم تخلیق کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کی اس ہنرمندی کے فن کو ڈاکٹر صلاح الدین حیدر لکھتے ہیں:

> وہ گہرے مطالعے، فکر، نظر کے مباحث اور معاصر دوستوں سے مکالمے کے ناتے اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے تھے کہ محنت کی قوت ہی صدیوں کے عمل میں تہذیبوں کی معمار رہی ہے۔ وہ فلسفہ جدلیات، تاریخی مادیت، قدرِ زائد اور طبقاتی کشمکش جیسے نظریات پر گہری نظر رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ غریب کسانوں اور خستہ حالوں کی دنیا اور ان کے قیاسات، اعتقادات پر خندہ تضحیک تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی نہیں ہے۔[۸]

احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانے ''بین'' میں توہم پرستی کو بیان کیا ہے یہ توہم پرستی صرف پنجاب میں ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں جہاں جہاں پیر پرست لوگ موجود ہیں اُن کے عقائد کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار رانو ہے۔ وہ بچپن ہی سے قرآن کی تلاوت بڑی خوش الحانی سے کرتی ہے، دولہے شاہ رانو کی تلاوت سن کر رُک جاتے ہیں اور اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ جب یہ لڑکی تلاوت کرتی ہے تو اِس کی آواز میں فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز آتی ہے تب سے لوگ اُس لڑکی کو پہنچی ہوئی سرکار سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دور دراز سے عورتیں پانی پر ''دم'' کے لیے آنے لگتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ یہ لڑکی، اللہ اور رسولؐ کے علاوہ سائیں دولہے شاہ جی کی مرید ہے۔ اِس کے متعلق لکھتے ہیں:

> تب یوں ہوا کہ عورتیں پانی سے بھرے برتن لاتیں اور تمہاری تلاوت ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتیں۔ تم قرآن پاک بند کر کے اُٹھتیں اور ''طفیل سائیں دولہے شاہ جی'' کہتی ہوئی، اِن برتنوں پر ''چھوہ'' کرتیں اور عورتیں یہ پانی اپنے عزیزوں کو پلاتیں تو بیمار اچھے ہو جاتے۔ بُرے نیک ہو جاتے۔ بے نماز نمازی ہو جاتے۔[۹]

اِسی افسانے میں ایک جگہ پر وہ دولہے شاہ جی کے مزار کی کرامت جو بہت مشہور ہوتی ہے اُس کو بیان کرتے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص غلط کام کرتا ہے تو مزار میں شگاف پڑ جاتا ہے۔ ایک ہاتھ بلند ہوتا ہے اور

اُس شخص کا کام تمام کر کے واپس چلا جاتا ہے۔ پھر سب کچھ ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد سئیں دولہے شاہ جی کا تین روزہ عرس ہوتا ہے اور اُن کی درگاہ سے پیغام آتا ہے کہ خواب میں دولہے شاہ جی نے حکم دیا ہے کہ میری رانو کو بلا کر تلاوت مجھے سناؤ۔ یہ بات رانو کے لیے جنت کی بشارت سے کم نہیں ہوتی۔ رانو کو درگاہ پہنچا دیا جاتا ہے اور تیسرے دن اس کے والدین اُسے لینے پہنچتے ہیں تو رانو کی حالت بدلی ہوئی ملتی ہے۔ وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہی ہوتی ہے۔ بعض لوگ کسی بزرگ کا سایہ بتا رہے ہوتے ہیں یہ بھی توہم پرستی کی ایک شکل ہے۔ رانو خود اپنے والدین کو سخت لہجے میں واپس جانے کو کہتی ہے اُس کی باتوں سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ اُس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ رانو اپنے عقیدے کے مطابق دربار کے شق ہونے کا انتظار کرتے کرتے ایک عرصہ دیوانگی میں گزار کر حضرت دولہے شاہ جی کے مزار پر اپنے والدین کی گود میں قیامت میں حساب کرنے کی دُہائی دیتے ہوئے دم توڑ دیتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اس تمام پس منظر کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے یہ بھی واضح کیا مزارات پر مذہب کے نام پر کیا کیا ہو رہا ہے:

> مجھ سے دور رہو بابا۔ میرے پاس نہ آنا اماں، میں اب یہیں رہوں گی۔ میں اس وقت تک یہیں رہوں گی۔ جب تک سائیں دولہا شاہ جی کا مزار شریف نہیں کھلتا۔ جب تک فیصلہ نہیں ہو پاتا میں یہیں رہوں گی۔ جب تک انصاف نہیں ہوگا۔ میں یہیں رہوں گی اور مزار شریف کھلے گا، آج نہیں تو کل کھلے گا۔ ایک مہینہ بعد، ایک سال بعد، دو سال بعد سہی، پر مزار شریف ضرور کھلے گا اور دستِ مبارک ضرور نکلے گا۔[۱۰]

قاسمی نے بڑی فنی مہارت سے کہانی بُنی ہے۔ کہانی کے عروج کو بڑی مہارت سے لطیف سانچ دیتے ہوئے بیان کر دیا اور عام قاری کا ذہن تھوڑی دیر کے لیے سوچتا ضرور ہے لیکن وہ یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا۔ اس کے دو اسباب ہیں: ایک تو قاسمی نے بات کو بڑے گہرے اشاروں میں بیان کیا ہے، دوسرے کہانی اپنے عروج کے بعد بھی آگے بڑھتی ہے اور ہمارا عام قاری کہانی کے اختتام پر کہانی کے رموز کو تلاشنے کا عادی ہے۔ ''بین'' قاسمی کی فنی مہارت کی خوبصورت عکاسی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانہ ''احسان'' میں ہمیں حقیقی زندگی اور رہن سہن کے اطوار نظر آتے ہیں۔ پنجاب

کے دیہات کے قاری کو ایسے لگتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے منظر کو اس افسانے میں دیکھ رہا ہے۔ قاسمی کہیں پرانے پلنگ پوش کی بات کرتے ہیں تو کہیں برقعہ اوڑھ کر ڈاکٹر کو بلا لانے والی عورت کی بات کرتے ہیں۔ ایک خاص انداز میں دستک دینے کی بات ہوتی ہے تو کہیں پُر معنی کھانسنے کے عمل میں ابلاغی قوت بھری جاتی ہے۔ کہیں پرانے گھسے ہوئے طشت نظر آتے ہیں تو کہیں دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنا دکھائی دیتا ہے۔ ایک عورت کے سراپے کے ساتھ ساتھ اس کا طرزِ عمل بھی دکھایا ہے یہاں تک کہ نشست و برخاست کے عمل کو بھی تمام منظر نگاری کے ساتھ یوں پیش کیا ہے:

> آج مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔'' وہ اسی مونڈھے پر آ کر بیٹھ گئی جس پر مجھے بٹھا گئی تھی۔ پھر وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میرے خیال میں آپ مونڈھے پر بیٹھیں ۔ میں چارپائی پر بیٹھتی ہوں۔'' وہ چارپائی پر بیٹھ گئی، مگر پھر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ ''میں چائے تو وہیں چھوڑ آئی!''[۱۱]

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''جوتا'' جاگیردارانہ نظام کے پس و پیش کو دکھاتا ہے۔ اس افسانے میں طبقاتی تقسیم کو دکھایا گیا ہے۔ جہاں پر علم حاصل کرنا اور زکوٰۃ وغیرہ دینا بھی وڈیرے کا حق ہے۔ اس افسانہ کے دو کردار ہیں۔ ایک ''کرموں قوال'' اور دوسرا ''گاؤں کا چودھری''۔ کرموں اپنے بچوں کو گاؤں کے سکول میں داخل کراتا ہے تو چودھری کو بہت بُرا لگتا ہے۔ وہ اُسے دارے پر بلا کر بے عزت کرتا ہے کہ شرم کرو مراثی ہو کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو۔ کرموں کے بچے پڑھ لکھ کر ملازم ہو گئے تو کرموں کے دن بدل گئے اور اس نے ایک سال زکوٰۃ نکالی۔ یہ بات چودھری پر قیامت کی طرح گزری۔ ابھی وہ اس صدمہ سے نکل نہیں پایا تھا کہ اُسے نئی بات پتہ چلی کہ کرموں میراثی پکی بیٹھک بنوانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور اپنے مشٹنڈوں کو بھیج کر کرموں پر اپنی رسم جاگیرداری یوں ادا کرواتا ہے:

> چودھری کا پلا ہوا منشی اس کی پیٹھ پر جوتے برسانے لگا۔ ساتھ ساتھ چودھری اسے گالیاں دیتا رہا اور کہتا رہا۔ ''بیٹھک بنائے گا کمینہ؟ دارا لگائے گا میری طرح؟ چار پیسے کیا آ گئے کہ اپنی اوقات ہی بھول گیا رذیل۔۔۔ لگاؤ۔۔۔ اور لگاؤ۔''[۱۲]

دیہی زندگی میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنی گزر بسر بہت مشکل سے کرتے ہیں ۔ جہاں بھوک ناچتی ہو وہاں پر علم اور اخلاقیات نظر نہیں آتے اسی معاشرے میں آ کر کسی گھر میں مال مویشی موجود ہوں اور اُن کے دودھ سے لسی اور مکھن بھی دستیاب ہوں تو وہ اپنے علاقے کا داتا بن جاتا ہے۔ اس میں دورویے پائے جاتے ہیں ایک گھرانہ وہ ہوتا ہے۔ جہاں لسی اور مکھن ازراہِ ترحم پورے گاؤں کے گھروں کو دیا جاتا ہے اور لسی بلوئی جا رہی ہوتی ہے کہ گاؤں کے ہر گھر سے برتن پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس کچھ گھرانے وہ بھی ہوتے ہیں ۔ جہاں اپنے اس اثاثے کو احساس برتری کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور پھر وہاں پر توہمات بھی ان کے احساس برتری میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں۔ انھی دیہاتی رسموں اور توہمات کو ثقافتی انداز میں قاسمی کے افسانے ''عالاں'' میں دیکھا جا سکتا ہے:

> کچھ دیر کے بعد اماں بولیں۔ ''اب میں مکھن نکالنے لگی ہوں۔ برا نہ ماننا۔ نیت بری نہ بھی ہو تو نظر لگ جاتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں نوراں نے مجھے مکھن کا پیڑا نکالتے دیکھا تو دوسرے دن مرغی کے انڈے کے برابر مکھن نکالا، اور اس سے اگلے دن چڑیا کے انڈے کے برابر۔ گائے کو تین دن مرچوں کی دھونی دی تو نظر اتری۔[۱۳]

چوکوں یا بازاروں اور گاڑیوں پر موبائل حکیم اپنی ادویات کو بیچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اس حد تک ''گاہک'' کو قائل کرتے ہیں کہ جسے ضرورت نہیں بھی ہوتی وہ بھی دوا لے لیتا ہے۔ یہ دوائی فروش کی فنی مہارت ہوتی ہے کہ وہ اس انداز سے بیماریوں کی علامات پیش کرتا ہے کہ اس کا ہر سامع خود کو بیمار سمجھنے لگتا ہے اور خود میں یہی علامات محسوس کرتا ہے۔ اس طرح جس کو ایک ڈبی بھی نہیں چاہیے ہوتی ،وہ دو، دو ڈبیاں خرید لیتا ہے۔ یہاں مسئلہ خرید و فروخت کا نہیں بلکہ مسئلہ اُن ڈبیوں کے اندر بھری ہوئی زہر کا ہے۔ جو سادہ لوح انسان اپنے اندر انڈیل لیتے ہیں۔ قاسمی کے افسانے ''سفارش'' میں اس طرح کا ایک کردار نظر آتا ہے جسے اپنی آنکھ کی لالی کے ختم کرنے کے لیے سانڈھے کا تیل بیچنے والے ایک حکیم سے واسطہ پڑتا ہے جو اُسے ایک سرمہ فروخت کرتا ہے۔ حکیم اِس طرح یقین دلاتا ہے کہ کمزور عقیدہ لوگ اُس کی باتوں میں آ جاتے اور اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں اِس کو پھر اللہ کی مرضی کا نام دے دیا جاتا ہے یہ باتیں بھی توہمات میں آتی ہیں کہ بنا پرکھے کسی بات پر یقین کر لینا۔ وہ سرمہ خرید کر جب بابا جی آنکھوں میں لگاتے ہیں تو اُن کی بینائی چلی جاتی

ہے۔اس سرمہ فروش کے فن سوداگری کو قاسمی نے اس طرح بیان کیا ہے:

> حکیم نے خدا رسول کی قسم کھا کر کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ حکیم خدا رسول کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لگا لے۔اماں نے بھی یہی صلاح دی۔اس نے ''لقمان حکیم،حکمت کا بادشاہ'' پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی۔[۱۴]

پنجاب کے جاگیرداروں اور جاٹوں کی ثقافت مذہب بدلنے پر بھی نہیں بدلی۔اُونچ نیچ، ذات پات کی تقسیم نے انسانی سماج کو دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے:ایک حاکم دوسرا محکوم، ایک آقا دوسرا غلام،ایک جابر دوسرا مظلوم۔اس کے پیچھے کال مارکس کے دلائل کی حقانیت بھی نظر آتی ہے۔ان رسوم و روایات کو ترقی پسند مصنفین نے اس انداز سے اجاگر کیا ہے کہ اس ادب کو پڑھنے کے بعد بغاوت کے عناصر پیدا ہوتے ہیں۔ غربا اور امرا کے مابین جو رشتہ اور رسم جاری ہے اُس میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے اِس توہم کی وجہ سے معاشرے کی بھی ذہنیت ایسی ہوگی ہے اُنہوں نے خود ہی اونچ نیچ کا فرق محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ چھوٹے پیشہ ور لوگ بڑے لوگوں کے برابر بیٹھنا بھی توہین سمجھتے ہیں بلکہ اُس وڈیرے کی جوتیوں میں بیٹھنا اور اُس کو دبانا فخر سمجھتے ہیں۔اس کی تصویر قاسمی اپنے افسانے ''لارنس آف تھلیبیا'' میں یوں دکھاتے ہیں:

> پلنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کھیس بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔اس کے وسط میں پلش کے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر پڑا تھا۔ ان کی انگلیوں، انگوٹھوں، پنڈلیوں، رانوں، کمر، پیٹھ، اور کندھوں اور سر کو بہت سے میراثی ، نائی، جھیور، دھوبی، موچی، کمہار اور کسان دبا رہے تھے۔[۱۵]

ہر علاقے میں شادی بیاہ کی مخصوص رسمیں ہوتی ہیں۔جن کے ادا کرنے میں جذباتی وابستگی بھی شامل ہوتی ہے۔ان رسموں کی ادائیگی توہم پرستی کی حد تک اساطیری اثر رکھتی ہے۔کوئی شادی ہو رہی ہو تو دولہا یا دُلہن کے رشتہ دار یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی ثقافت کے مطابق جو جو رسمیں موجود ہیں ان کو ہر صورت ادا کیا جائے۔کوئی ایک رسم بھی نہ چھوٹے۔کیوں کہ رسموں کی ادائیگی میں جہاں جذبات کا اظہار یا خوشی کے عناصر موجود ہیں وہاں اُس شادی کے دور رس نتائج کی اور کامیابی کی ضمانت کے طور پر ایک اطمینان ملتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ برصغیر میں مائیں اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کے لیے برسوں کا انتظار کرتی ہیں۔ اوراس انتظار میں وہ رسموں کو نبھاتے ہوئے خواب دیکھتی ہیں۔ انھی رسموں اور توہمات کو قاسمی اپنے افسانے ''ماسی گل بانو'' میں پیش کرتے ہیں:

> برات سے تین روز پہلے گل بانو کو مایوں بٹھا دیا گیا۔ اور اسے اتنی مہندی لگائی گئی کہ اس کی ہتھیلیاں سرخ پھر گہری سرخ اور پھر سیاہ پڑ گئیں اور تین دن تک آس پاس کی گلیاں گل بانو کے گھر سے اٹھتی ہوئی مہندی کی خوشبو سے مہکتی رہیں۔[۱۶]

دیہی سماج میں جہیز اکٹھا کرنے میں اتنی دیر لگ جاتی ہے کہ شادی کی عمر ہی گزر جاتی ہے۔ سونا اکٹھا کرتے کرتے بالوں میں چاندی اُتر آتی ہے۔ ایک مسلسل تناؤ نفسیاتی مسائل کا سبب بنتا ہے اور ان مسائل کو حل کرانے کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے تعویز گنڈوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ان کی بیماری کو جنوں اور بھوتوں کے نام سے منسوب کر لیا جاتا ہے۔ اسی بیماری میں لڑکی اپنا حسن بھی گنوا بیٹھتی ہے اور اگر پیر زیادہ سعادت مند ہو تو عزت بھی گنوا بیٹھتی ہے۔ لڑکی کو دورے پڑنے بند ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کے نزدیک پیر کے تعویز کام کر جاتے ہیں۔ اس توہم کی مثال قاسمی اپنے افسانے ''ماسی گل بانو'' میں دیتے ہیں۔ جہاں ایک لڑکی ''تاجو'' سات سال منگنی کے بعد بھی رخصتی نہ ہونے پر ہسٹریا کا شکار ہو جاتی ہے۔ لڑکی کو دور ے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں تو باپ اُسے چارپائی سے باندھ دیتا ہے۔ اس پر پیروں کے روایتی ظلم ڈھائے جانے کا منظر کچھ یوں ہے:

> روتی پیٹتی بیوی کو اس کے پہرے پر بٹھا دیا اور خود پیروں فقیروں کے پاس بھاگا پھرا۔ کسی نے تاجو کی انگلیوں کے درمیان لکڑیاں رکھ کر اس کے ہاتھ کو دبایا، کسی نے نیلے کپڑے میں تعویذ لپیٹ کر اسے جلایا۔ اور اس کا دھواں تاجو کو ناک کے راستے پلایا۔ کسی نے تاجو کے گالوں پر اتنے تھپڑ مارے کہ اس کے مساموں میں سے خون پھوٹ کر جم گیا۔[۱۷]

اِسی افسانے میں ہسٹریا کی شکار ''تاجو'' کے گھر والے سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ تاجو میں جن آ گئے ہیں یہ بات ہمارے معاشرے میں عام پائی جاتی ہے کہ ایک لمبے عرصے تک بچیوں کی شادی نہیں کی جاتی ہے۔ جب

وہ نفسیاتی تناؤ کا شکار ہو کر اِس طرح کی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہیں تو پھر اُس پر یہ لیبل لگا دیا جاتا ہے کہ اِس پر سایہ ہے اِس میں جن آ گئے ہیں پھر اُس کا علاج کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتا ہے۔''ماسی گل بانو'' کے بارے میں مشہور ہوتا ہے کہ اُس میں بھی جن آتے ہیں وہی تاجو کا جن نکال سکتی ہے۔''ماسی گل بانو'' جب تاجو کے حالت دیکھتی ہے تو وہ سمجھ جاتی ہے کہ اِس کو کیا مرض ہے کیونکہ وہ بھی اِن حالات نبرآزما تھی۔ وہ تاجو کی شادی کا کہتی ہے کہ اِس کی فوراً شادی کر دو جب دولہا آئے گا تو جن نکل جائے گا۔قاسمی اِس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ماسی نے کہا۔'' کچھ بھی کرے تاجو کی فوراً شادی کر دو۔ جوانی کی انگیٹھی پر چپ چاپ اپنا جگر پھونکتے رہنا کسی کا کام نہیں ہے اور تمہاری تاجو تو بالکل چھلکتی ہوئی لڑکی ہے۔ اِس کی شادی کر دو ۔دولہا آیا تو جن چلا جائے گا۔[۱۸]

یہ توہم بھی عام ہے کہ شادی کے بعد جب''تاجو'' جیسی لڑکیاں ٹھیک ہو جائیں تو کہا جاتا ہے کہ جن چلا گیا ہے جب کہ وہ اُس بیماری سے چھٹکارا پا چکی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ایسی حرکتیں کرتی ہیں جس سے یہ لگتا ہے کہ اِن پر جنات کا سایہ ہے۔

ہمارے معاشرے میں تو اب مرنا جینا بھی توہمات کے زمرے میں آنے لگا ہے جب کہ زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ایک قبیح قسم کی توہم ہمارے معاشرے میں عام ملتی ہے کہ جب کسی آدمی کی شادی ہوتی ہے اُس کی نئی نویلی بیوی گھر آتی ہے اللہ کا کرنا ایسے ہو کہ اگر وہ شخص شادی کے کچھ عرصہ بعد دنیا سے رخصت ہو جائے تو اُس کی موت کی ذمہ داری اُس کی بیوی پر ڈال دی جاتی ہے۔اُس عورت کو ڈائن جیسے لقب سے نوازا جاتا ہے اُس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔احمد ندیم قاسمی کے ایک افسانے''جن وانس'' میں اسی طرح کا واقعہ ملتا ہے جس میں ایک بڑھیا نوراں مراثن ہوتی ہے جس کا ایک بیٹا''مست الست'' ہوتا ہے جو شہنائی بجاتا ہے۔جس پر اُن کے گھر کا خرچا چلتا ہے۔اچانک وہ شہنائی بجانا چھوڑ دیتا ہے قبیلے والوں کا خیال ہوتا ہے کہ اِس میں بھی جن آ گئے ہیں۔نوراں کچھ عرصے بعد مست الست کی شادی اپنی بھتیجی بانو سے کر دیتی ہے۔نوراں اپنی بہو بانو سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مست الست کہہ کہ وہ دوبارہ شہنائی بجائے۔مست

الست بانو کی فرمائش پر شہنائی بجانے لگتا ہے۔ سارے مراثی اُس کی شہنائی سن رہے ہوتے ہیں کہ اِس دوران ہی شہنائی بجاتے ہوئے ہی وہ مر جاتا ہے۔ اُس کی موت کا سارا الزام بانو پر دھرا جاتا ہے ۔ اِس سارے واقعے کو قاسمی یوں بیان کرتے ہیں:

> مست الست پیچھے گر گیا پھر جب اُس کی نبضیں دیکھی گئیں تو وہ مر چکا تھا۔ اُس وقت نوراں نے دھڑاک سے ایک دو ہتڑ اپنے سینے پر مارا اور پھر ایک دو ہتر بانو کی پیٹھ پر مار کر بین کرنے لگی۔ ''میرے مست الست کا دم تو یہ سانپنی پی گئی لوگو، یہ جو میری بھتیجی ہے، میری بہو ہے میرے بیٹے کی قاتل ہے۔[۱۹]

مشرق کے انسان کو اپنی مصنوعی عزت اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔ اس نام نہاد عزت کے لیے اُسے اپنے ضمیر کے خلاف بھی جانا پڑتا ہے ۔ پہلے دور کے انسان کا مسئلہ سانسوں کی بقاء تھا۔ اب کے باشندوں کا مسئلہ اپنی خود ساختہ سفید پوشی کو برقرار رکھنا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا مشہور افسانہ ''گھر سے گھر تک'' اسی مصنوعیت کے شکار دو گھرانوں کا قصہ ہے۔ ایک گھرانہ کسی سے بڑی گاڑی مانگ کر لڑکی والوں کے گھر اپنا مصنوعی رعب ڈال کر رشتہ مانگنے آتا ہے تو اس گھر کے اندر صوفوں ، قالینوں، ریشمی پردوں اور چینی کے برتنوں کو دیکھ کر خود مرعوب ہو جاتا ہے۔ دراصل دونوں کی نگاہ ایک دوسرے پر ہوتی ہے اور ظاہری نمود و نمائش اور بناوٹ کو دیکھ کر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن یہ سب دکھلاوا ایک طرفہ کی بجائے دو طرفہ ہوتا ہے۔ جب سارا پول کھل جاتا ہے تو اس کا انجام بہت خوب صورت اور قابلِ تقلید نظر آتا ہے۔ اِس افسانہ میں وہی اونچ نیچ کا تصور نظر آتا ہے ہم من الحیث القوم اِس دوڑ میں شامل ہیں دوسروں نیچا دکھایا جائے یہ بھی توہم پرستی کی ایک قسم ہے۔

سکھ تہذیب اور معاشرے کی اپنی ایک واضح شناخت ہے۔ ان کے ہاں چار چیزوں کا ہونا مذہبی شرائط سے ہے: کیس، کرپان، کڑا اور کچھیرا۔ سکھوں کی جنم بھومی بھی پنجاب ہے اس لیے پنجاب کے اس خاص رنگ کو بھی قاسمی نے پیش کیا ہے۔ قاسمی کا لازوال افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' اپنے موضوع اور انجام کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ اس پہ مستزاد یہ کہ اس افسانے میں جذبات و احساسات کی شکست و

ریخت کے منظر میں رسم و توہم کے بیان کو نہیں بھلایا گیا۔ اس افسانے کے کردار ''اختر'' کو شر پسندوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جب سکھوں ایسا حلیہ دیا گیا تو اس کا بیان سکھ ثقافت کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ افسانے میں بچے کے لحاظ سے تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے:

> چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لووں تک کس کے بندھی ہوئی پگڑی۔ وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آ کر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔[۱۵]

احمد ندیم قاسمی نے زیادہ تر افسانے دیہاتی پس منظر میں لکھے ہیں اس لیے اُن کے افسانوں میں دیہات سے جڑی ہوئی تمام باتیں ملتی ہیں۔ اُنھوں وہاں کے ماحول کو پوری طرح پیش کیا ہے، وہاں کے لوگوں کا زیادہ رجحان رسومات وتوہمات کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں جس قدر رسومات وتوہمات کی بھرمار ہے شاید ہی کسی اور افسانہ نگار کے ہاں ہوں۔ انھوں نے اِس رسم اور توہم کو ہر زاویہ سے دیکھا ہے اور اپنے افسانوں میں آزادانہ برتا ہے۔ انھوں نے رسومات وتوہمات کو بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں طریقوں سے استعمال کیا ہے اور اس کی ایک غیر رسمی ادبی تاریخ مرتب کر دی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی رسومات وتوہمات کو پیش کرنے افسانہ نگاروں میں سرِ فہرست ہیں۔

## حواشی وحوالہ جات


۱۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲

۲۔ قاسمی، احمد ندیم، ملاقات بہ خلیق احمد خلیق، مشمولہ افکار کراچی، ندیم نمبر، ص ۲۶۷

۳۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ صورت و معنی، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۹۹

۴۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، ''افسانہ نگار ندیم''، مشمولہ افکار کراچی، ندیم نمبر، ص ۳۷۰

۵۔ منٹو، سعادت حسن، منٹو کے خطوط، (مرتبہ) احمد ندیم قاسمی، کتاب نما، راولپنڈی، سن ندارد، ص ۱۱

۶۔ گوپی چند نارنگ،اردو افسانہ: روایت اور مسائل ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،۱۹۸۱ء،ص۱۳۳
۷۔ تاثیر،ایم ڈی ،ڈاکٹر،''پیش نامہ''،مشمولہ رِم جھم،احمد ندیم قاسمی،اساطیر،لاہور،۲۰۰۰ء،ص۱۲
۸۔ صلاح الدین حیدر، ڈاکٹر، ''احمد ندیم قاسمی:بیسویں صدی کی قدآور شخصیت''، مشمولہ روزنامہ خبریں ملتان،۱۰جولائی ۲۰۰۷ءادبی صفحہ
۹۔ قاسمی،احمد ندیم،افسانے ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور، ۲۰۰۸ء،ص۱۱
۱۰ ایضاً،ص۱۴
۱۱۔ ایضاً،ص۲۹
۱۲۔ ایضاً،ص۳۶
۱۳۔ ایضاً،ص۴۳
۱۴۔ ایضاً،ص۵۶
۱۵۔ ایضاً،ص۷۲
۱۶۔ ایضاً،ص۸۶
۱۷۔ ایضاً،ص۹۲
۱۸۔ ایضاً،ص۹۲
۱۹۔ ایضاً،ص۱۵۸
۲۰۔ ایضاً،ص۲۱۹